رضا علی عابدی

(ولادت: ۳۰ نومبر ۱۹۳۵ء)

رضا علی عابدی روڑکی، ضلع ہری دوار (اُتر کھنڈ، انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی (پاکستان) آ گئے۔ انھیں بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا چناں چہ طالب علمی کے زمانے ہی میں اپنے زورِ مطالعہ کی مدد سے فنِ خبر نگاری سے مکمل واقف ہو چکے تھے جس کی بنا پر انھوں نے بیس برس کی عمر میں پہلی بار بائیں ہاتھ سے انگریزی خبر کا ترجمہ کیا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے عرصے میں وہ عملی طور پر روزنامہ "حریت" کے ساتھ منسلک تھے، چناں چہ جنگ کے تمام حالات وواقعات کو روزنامہ "حریت" میں رپورٹ کرتے رہے۔

اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ چلے گئے اور پھر وہیں ۱۹۷۲ء میں بی بی سی سے منسلک ہو کر عملی زندگی کا آغاز کیا اور کچھ ہی عرصے میں بی بی سی اردو کے پروگراموں کو اس دل نشیں انداز میں پیش کیا کہ دنیا بھر کے اردو بولنے والوں کے دلوں میں اردو کی قدر و منزلت بڑھا دی اور اِسی پلیٹ فارم سے ریڈیائی دستاویزی پروگراموں کی وجہ سے خاصی شہرت پائی، جہاں سے وہ ۱۹۹۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

رضا علی عابدی، جنھیں اردو، سندھی، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بڑا عبور حاصل ہے، بڑے بسیار نویس ہیں۔ وہ تادمِ تحریر تیس سے زیادہ کتابیں تصنیف کر چکے ہیں جن میں "جرنیلی سڑک"، "شیر دریا"، "جہازی بھائی"، "ریل کہانی"، "پہلا سفر"، "کتب خانہ"، "اردو کا حال"، "اپنی آواز"، "کتابیں اپنے آبا کی" اور "جانے پہچانے" شامل ہیں۔ ان میں سے نصف تصانیف کے مخاطب بچے ہیں۔

یوں تو رضا علی عابدی کی ہر تصنیف ہی اہم ہے مگر اس وقت ہمارا روئے سخن اُن کے سفر نامے "جرنیلی سڑک" کی طرف ہے۔ یہ طویل جرنیلی سڑک جسے "جی ٹی روڈ" بھی کہا جاتا ہے اور جو موجودہ بنگلہ دیش کو افغانستان کے ساتھ ملاتی ہے، برِعظیم کے حکمران شیر شاہ سوری (۱۴۷۲ء-۱۵۴۵ء) نے اپنے دورِ اقتدار میں تعمیر کرایا تھا۔ اس سڑک کی چھان بین میں رضا علی عابدی نے ایک ماہ تک مسلسل سفر کیا۔ اس کتاب میں جرنیلی سڑک پر واقع تمام اہم آبادیوں، اُن کی وجہ تسمیہ اور ثقافت کا تذکرہ ہے۔ مصنف کی یہ تحریر طنز و مزاح، اُداسیوں اور خوشیوں کے مختلف رنگوں سے مزین ہے۔

سبق: ۱۰

لڑی میں پروئے ہوئے منظر

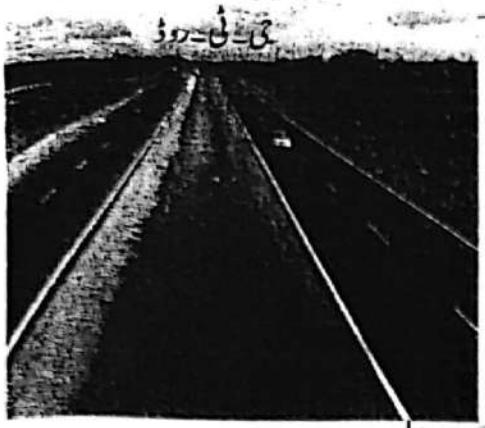

مقاصدِ تدریس:

۱۔ طلبہ کو اُردو میں سفر نامے کی روایت سے آگاہ کرنا۔

۲۔ طلبہ کو بتانا کہ جرنیلی سڑک کا دوسرا نام جی ٹی روڈ ہے اور یہ سڑک سنار گاؤں (بنگلہ دیش) سے لے کر کابل (افغانستان) تک تقریباً تین ہزار چھے سو کلو میٹر لمبی ہے اور اسے پہلے پہل شیر شاہ سوری (۱۴۷۲ء-۱۵۴۵ء) نے اپنے دورِ اقتدار میں تعمیر کرایا تھا۔

۳۔ رضا علی عابدی کے حوالے سے طلبہ کی معلومات میں اضافہ کرنا کہ "لڑی میں پروئے ہوئے منظر" میں متذکرہ باتیں سنی سنائی باتیں نہیں بلکہ یہ تمام باتیں مصنف کی دریافت ہیں۔

۴۔ طلبہ کو متشابہ الفاظ اور رموزِ اوقاف: ندائیہ، فجائیہ، واوین، قوسین اور خط کے استعمال سے آگاہ کرنا۔

عجیب سڑک ہے یہ جرنیلی سڑک بھی۔

آپ اس پر چلیں اور شعور کی آنکھیں کھلی رکھیں تو جتنے اور جیسے منظر اس راہ میں آتے ہیں، شاید ہی کہیں آتے ہوں۔

آپ چلتے جاتے ہیں اور ایک نہایت آباد سرزمین کی معاشرت، معیشت اور تاریخ آپ کے ہم راہ چلتی ہے۔ کہیں حیرت آپ کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتی ہے اور کہیں عبرت۔ منظر بدلتے جاتے ہیں مگر وہ لڑی نہیں بدلتی جس میں وہ سارے کے سارے پروئے ہوتے ہیں۔

مَیں پشاور سے چلا تو بالا حصار کے نیچے ایک پتھر لگا ہوا نظر آیا۔ اُس پر بڑے حرفوں میں "شاہراہِ پاکستان" لکھا تھا اور کسی وزیر کا نام لکھا تھا جس نے کبھی وہ پتھر وہاں لگایا ہو گا۔

کیسا دل چسپ اتفاق ہے۔ سڑک اور وزیر دونوں آنی جانی چیزیں ہیں۔ وادیِ پشاور اب بھی بہت سرسبز نظر آ رہی تھی۔ جن زمینوں کو آتے جاتے لشکروں نے بار بار روندا ہو گا وہ اب تک ہری بھری تھیں۔ کبھی ریلوے لائن سڑک کے قریب آجاتی تھی۔ کبھی بجلی کے بڑے بڑے کھمبے اور موٹے موٹے تار ساتھ ساتھ دوڑنے لگتے تھے۔ بستیاں آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں۔ رمضان کا مہینا تھا، ان کے چائے خانے بند پڑے تھے۔ اس تمازت کے عالم میں کہیں سے اچانک دریائے کابل آگیا۔ یہ نوشہرہ کے قریب آجانے کی پہچان تھی۔

یہ شہر شاید اکبر نے آباد کیا تھا۔ کبھی یہاں دریا کے دائیں کنارے پر نوشہرہ خورد اور بائیں کنارے پر نوشہرہ کلاں، یہ دو گاؤں تھے۔ ایک سرائے بھی تھی جس میں جہانگیر ٹھہرا تھا۔ ایک قلعہ بھی تھا مگر تمام سرائیں اور قلعے گزرتے قافلوں کی گرد میں مل کر خود بھی گرد ہو جایا کرتے ہیں۔

اب ہم دریا در دریا چل رہے تھے۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی وہاں تک زمین تھی، اس کے آگے بھی زمین تھی اور ان ہی زمینوں میں

وہ چھوٹا سا گاؤں، لاہور، آج بھی آباد تھا جس میں سنسکرت قواعد کا سب سے بڑا عالم پانینی پیدا ہوا تھا۔

کچھ اور آگے ایک اور گاؤں "ہنڈ" تھا۔ اس مشینی دور میں یہ جاننے کی فرصت کسے ہے کہ یہی ہنڈ کبھی گندھارا کا پایۂ تخت تھا۔ یہیں آکر سکندر نے (دریائے) سندھ پار کیا اور چنگیز خاں یہیں سے دریا کا پاٹ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔ یہیں محمود غزنوی نے پنجاب کے راجا جے پال کو شکست دی تھی۔ اسی کو مؤرخوں نے ہندوستان کا دروازہ کہا تھا۔ مگر اب یہ دریائے سندھ کے کنارے ایک گم نام سا گاؤں ہے جس کا ماضی تاریخ کی دھندلی چادر اوڑھ کر کبھی کا سو چکا ہے۔ اچانک خیر آباد آ گیا۔ سامنے دریائے سندھ شاہانہ انداز میں بہا چلا جا رہا تھا جس کے دوسرے کنارے پر عظیم الشان قلعہ اٹک تھا، اکبر اعظم کا اٹک بنارس، چار صدیوں کا عینی شاہد، کتنے ہی زمانوں کا چشم دید گواہ۔ اٹک کے قلعے میں اب فوج رہتی ہے۔

یہاں ہماری گاڑی نے نئے پل کے راستے دریا پار کیا۔ انگریزوں کا بنایا ہوا لوہے کا پل سامنے نظر آتا رہا۔ کبھی سارا ٹریفک اُس مضبوط پل کے اوپر چلا کرتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ گاڑی لوہے کے جنگل سے گزر رہی ہے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ انگریز چلتے وقت بتا گئے تھے کہ ان کے تمام پلوں کی عمر پورے ایک سو برس ہو گی، اس کے بعد نئے پل بنانا۔ جس روز میں اٹک پہنچا یہ پل ایک سو دو سال پرانا ہو چکا تھا۔ موٹر گاڑیاں نئے پل پر چلتی ہیں۔ ریل گاڑیاں اب بھی دعائیں دم کر کے اُسی بوڑھے پل پر سے گزاری جاتی ہیں۔

کہتے ہیں کہ اٹک کا یہ نام اکبر بادشاہ نے رکھا تھا۔ نام رکھنے کا اُسے بڑا شوق تھا۔ کسی جگہ کا خوب صورت منظر دیکھ کر اس کے مُنھ سے بے ساختہ "واہ" نکلی۔ اُس مقام کا نام "واہ" رکھ دیا گیا۔ پھر چلتے چلتے اُس کا قافلہ دریائے سندھ کے کنارے پہنچ کر اٹک گیا، وہ جگہ "اٹک" کہلائی۔ پھر قافلہ خیر سے پار اُتر گیا، وہ مقام "خیر آباد" کہلایا۔

اس کی ایک کہانی اور بھی ہے۔ اکبر نے اپنے پیش رو شیر شاہ سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ بہت سے کام جو اکبر نے کیے، ان کی بنیاد شیر شاہ رکھ گیا تھا۔ شیر شاہ کی مملکت بہار سے پنجاب تک پھیل گئی تھی۔ اس کے ایک سرے پر بہار میں قلعہ رُہتاس تھا۔ اس کے دوسرے سرے پر پنجاب میں گکھڑوں کی سرزمین پر شیر شاہ نے دوسرا قلعہ بنوایا تو اس کا نام بھی رُہتاس رکھا۔ بالکل اسی طرح اکبر کی مملکت کے ایک کنارے پر کٹک تھا، دوسرے کنارے کا نام اس نے اٹک رکھا۔ یہاں کشتیاں چلانے اور دریا پار کرانے کے لیے اکبر بنارس سے ملاح لایا اور اس خیال سے کہ وہ اب اسی جگہ کو وطن سمجھیں۔ اس چھوٹے سے شہر کو اٹک بنارس کا نام دے دیا گیا۔ ملاحوں کی گزر بسر کے لیے جاگیر اور رہنے کے لیے شہر میں ایک محلہ دیا گیا جو "ملاحی ٹولہ" کہلاتا ہے اور جہاں پرانے ملاحوں کی آل اولاد اب تک آباد ہے۔

اس کے پاس جہانگیر کے زمانے کی سرائے ہے۔ بہت بڑا احاطہ ہے جس کے گرد مسافروں کے لیے سیکڑوں کمرے ہیں۔ اس کے بعد کلکتے تک اتنی اچھی حالت میں کوئی سرائے نظر نہیں آئی۔

خود قلعے کا قبضہ یہ ہے کہ مغلوں نے اسے کابل والوں سے چھینا، کابل والوں سے اسے سکھوں نے چھینا، انگریزوں نے سکھوں سے چھینا، سکھوں نے دوبارہ انگریزوں سے چھینا، انگریزوں نے دوبارہ سکھوں سے چھینا۔ اس چھینا جھپٹی کے باوجود یہ قلعہ آج تک کھڑا ہے اور جو اس سے بھی زیادہ مستعدی سے کھڑا ہے وہ دریا پار پنجاب کے علاقے میں داخل ہونے والی گاڑیوں کی تلاشی لینے والا کسٹم اور ایکسائز کا عملہ ہے۔

ہمیں یاد ہے کسی زمانے میں جب ہم جیسے چھوٹے لوگ لنڈی کوتل سے غیر ملکی کپڑا، بلیڈ، صابن اور سگریٹیں لے کر لوٹتے تھے تو اس جگہ تلاشی میں پکڑے جاتے تھے۔ اس زمانے میں بڑے لوگ اللہ جانے کیا کیا لے کر لوٹتے ہیں اور اس جگہ سے صاف نکل جاتے ہیں، جیسیں آج بھی چھوٹے ہی لوگوں کی ٹٹولی جاتی ہیں۔

راستے میں حسن ابدال کا پڑاؤ تھا۔ کبھی یہ شہر اتنا دل کش رہا ہو گا کہ مغل مؤرخ لکھتے ہیں کہ لاہور سے کابل جانے والی شاہراہ پر یہ حسین ترین منزل ہے۔ مگر آج کے حسن ابدال میں جھرنوں کے شور اور چڑیوں کی چہکار سے زیادہ جو چیز گونجتی ہے وہ سڑک کی دونوں طرف ہوٹلوں کے لاؤڈ اسپیکر ہیں جن پر دن رات فلمی گانے بجا کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے مالکوں کا خیال ہے کہ جس کے لاؤڈ اسپیکر کی آواز زیادہ اونچی ہو گی اس کے ہاں گاہک بھی زیادہ آئیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ حسن ابدال رونق کی اور عبرت کی جا ہے۔ دونوں طرف انگریزوں کے زمانے کے اُونچے اُونچے درخت دُور تک سبزہ، نالیوں میں بہتا ہوا چشمے کا شفاف پانی، اِدھر اُدھر پرانی عمارتیں اور مسجدیں۔ ایک طرف سکھوں کا مشہور گردوارہ پنجہ صاحب اور دوسری طرف بابا ولی قندھاری کی چلّہ گاہ۔ کشمیر کی طرف مڑ جانے والی سڑک پر کسی مغل بی بی کی قبر۔ کوئی کہتا ہے کہ اکبر کی بیٹی لالہ رخ تھی وہ یہاں عالم شباب میں مر گئی تھی، بعد میں طامس مور نے اپنی ایک نظم میں اُسے زندہ کر دیا۔

حسن ابدال کے قریب اُس مغل باغ کے آثار اب بھی موجود ہیں جس کے تالاب سے جہانگیر نے مچھلیاں پکڑی تھیں اور ان کی ناک میں موتی پرو کر پھر پانی میں چھوڑ دیا تھا۔ یہیں وہ بڑی سی چٹان ہے جس کے بارے میں سکھوں کا عقیدہ ہے کہ اسے بابا ولی قندھاری نے پہاڑی کے اوپر سے لڑھکا دیا تھا اور نیچے بابا گرونانک نے چٹان کو اپنے ایک پنجے پر روک لیا تھا۔ چٹان پر نانک کے پنجے کا نشان بن گیا تھا جو آج تک موجود ہے۔ تاریخ کا حساب کتاب رکھنے والے کہتے ہیں کہ جب گرونانک پشاور جاتے ہوئے حسن ابدال آئے تھے، بابا ولی قندھاری اُس سے بہت پہلے نہ صرف حسن ابدال سے بلکہ اس عالم فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ پانچ انگلیوں کا یہ نشان حسن ابدال والوں نے تراشا تھا۔

حسن ابدال سے آگے بڑھیں تو واہ چھاؤنی ہے۔ وہاں مغلوں کے دور کی بہت بڑی باؤلی ابھی تک اچھی حالت میں موجود ہے۔ کسی زمانے میں لوگ، اُن کے مویشی اور ہاتھی گھوڑے باؤلی کی سیکڑوں سیڑھیاں اُتر کر سیراب ہوا کرتے تھے۔ اب لوگ یہ مشقت نہیں کرتے بلکہ پمپ کے ذریعے سے پانی کھینچ لیتے ہیں۔

واہ سے آگے سرائے کالا ہے۔ جاتی روڈ پر یہ چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں کالے پتھر کی کونڈیاں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کے باہر کے کناروں پر بیل بوٹے کھود کر ان میں رنگ بھر دیا جاتا ہے اور پھر اوپر تلے چن کر ان ہانڈیوں کے مینار سے کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ یہی سرائے کالا کی پہچان ہے۔ ظاہر ہے کہ کبھی اس جگہ مسافروں کے لیے سرائے رہی ہو گی، جہانگیر نے بھی یہاں پڑاؤ ڈالا تھا۔ اُس وقت اس جگہ کا نام کالا پانی تھا۔

ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ شیر شاہ اور مغلوں کے زمانے میں جو ہزاروں سرائیں بنائی گئی تھیں بعد میں ان کے گرد بستیاں آباد ہوتی گئیں۔ خود سرائیں نہیں رہیں البتہ آبادیوں کے نام کے ساتھ لفظ "سرائے" جڑا رہ گیا۔ مردم شماری کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان پاکستان میں کئی سو شہروں، قصبوں اور دیہات کے ناموں کے ساتھ لفظ "سرائے" لگا ہوا ہے۔ اگر نقشے پر اُن تمام مقامات کو لکیروں سے ملایا جائے تو کیا قدیم سڑکوں کا نقشہ خود بخود نہیں اُبھرے گا؟

جہاں یہ سرائے کالا ہے وہاں سے صرف چند کلو میٹر دور ٹیکسلا کے کھنڈر ہیں، وہی ٹیکسلا جو ہندوستان کے تاج میں ایسے نگینے کی طرح جڑا تھا جس سے پھوٹ کر گیان دھیان کی کرنیں ایک عالم کو منور کیا کرتی تھیں۔ وہ شہر اب یہیں آنکھیں موندے سو رہا ہے۔

سرائے کالا سے چار میل آگے مارگلہ کی پہاڑی دیوار بن کر کھڑی ہے۔ پہاڑی میں ایک کٹاؤ ہے لیکن اُس دن مَیں سوچنے لگا کہ اس پچیس تیس ہاتھ چوڑے پہاڑی شگاف کے راستے ہزاروں برسوں کے دوران میں ان گنت قبیلے، قافلے اور لاؤ لشکر گزرے ہوں گے۔ چین، افغانستان، وسطی ایشیا، ایران اور ایشیائے کوچک سے چاہے ایک تنہا مسافر آیا ہو چاہے ایک لشکرِ جرار، وہ سب مارگلہ کے اس کٹاؤ پر چڑھے ہوں گے اور اوپر پہنچ کر انھوں نے دوسری طرف کا نظارہ کیا ہو گا تو تاحدِ نگاہ ہندوستان ہی ہندوستان دکھائی دیا ہو گا۔ مارگلہ کا یہ تاریخی کٹاؤ ابھی موجود ہے۔ جسے دیکھنا ہو فوراً جا کر دیکھ لے کیوں کہ پہاڑی پتھر کاٹ کاٹ کر فروخت کرنے والے بیوپاریوں کی جدید مشینیں اس پہاڑی پر اس طرح ٹوٹی پڑ رہی ہیں جیسے قند کی ڈلی پر بھوکی چیونٹیاں۔

بعد میں جب انگریزوں نے گرینڈ ٹرنک روڈ کی تعمیر شروع کی تو انجینئروں نے اس کٹاؤ سے ہٹ کر پہاڑی میں گہرا درّہ کاٹ دیا۔ اس سے آنا جانا آسان ہو گیا۔ البتہ بلندی پر اس سڑک کے آثار ابھی موجود ہیں جو غالباً اکبر نے بنائی تھی تاکہ کابل پر حملے کے لیے یہاں بھاری توپیں آسانی سے چڑھائی جا سکیں۔ اس درّے کے اوپر پہاڑی کی چوٹی پر نکلسن کی لاٹ میلوں دور سے نظر آنے لگتی ہے۔

دونوں وقت مل رہے تھے۔ مَیں مری روڈ پر کمپنی باغ کے سامنے کی گلی میں پہنچا۔ یہ گلی مَیں نے چوتھائی صدی پہلے بھی دیکھی تھی۔ وہی ٹین کی چادروں کا بڑا سا گیٹ، وہی اینٹوں کے فرش والا دالان اور اس کے گرد مطب کے وہی کمرے، مگر اب پورے شہر کی طرح یہ گلی بھی بدل گئی تھی۔ اگر کوئی نہیں بدلا تھا تو وہ گلی میں کھیلنے والے چھوٹے چھوٹے بچے جو تمام عالم سے بے خبر، تمام زمانے سے بے نیاز آج بھی ہاتھوں میں ہاتھ دیے اپنے کھیل میں مگن تھے۔

مَیں نے دعا مانگی کہ یہ ہاتھ کبھی نہ چھوٹیں، ہمسائیگی کے یہ رشتے کبھی نہ ٹوٹیں۔ یہ گلیاں یوں ہی آباد اور ان میں کھیلتے ہوتے بچے یوں ہی شاد رہیں۔

(جرنیلی سڑک)

مشق

(۱) درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

(i) مصنف کو بالا حصار سے نیچے آنے کے بعد ایک پتھر پر لکھا نظر آیا:

(الف) شاہراہِ ریشم (ب) شاہراہِ پاکستان (ج) شاہراہِ قدیم (د) شاہراہِ جرنیل

(ii) وادیِ پشاور نظر آ رہی تھی:

(الف) ریگ زار (ب) مرغزار (ج) ویران (د) سرسبز

(iii) مورخوں نے ہندوستان کا دروازہ کہا تھا:

(الف) لنڈی کوتل کو (ب) پشاور کو (ج) ہنڈ کو (د) نوشہرہ کو

(iv) اٹک کا نام رکھا تھا:

(الف) محمود غزنوی نے (ب) شہاب الدّین غوری نے (ج) اکبر اعظم نے (د) شیر شاہ سوری نے

(v) سکھوں کا مشہور گرد وارہ واقع ہے:

(الف) نوشہرہ میں (ب) اٹک میں (ج) حسن ابدال میں (د) واہ میں

(vi) نوشہرہ کے قریب آجانے کی پہچان تھی:

(الف) دریائے سندھ (ب) دریائے کابل (ج) دریائے ہرو (د) دریائے سُون

(۲) سبق "لڑی میں پروے ہوئے منظر" کے متن کے مطابق دیے ہوئے سوالوں کے جواب لکھیں۔

(الف) مصنف کو (دُور سے) وادیِ پشاور کیسی نظر آ رہی تھی؟

(ب) محمود غزنوی نے راجا جے پال کو کس جگہ شکست دی تھی؟

(ج) اٹک کا قلعہ کس دریا کے کنارے بنایا گیا تھا؟

(د) وہ کون سا بادشاہ تھا جسے جگہوں کے نام رکھنے کا بڑا شوق تھا؟

(ہ) مؤرخین کے نزدیک لاہور سے کابل جانے والی شاہراہ پر حسین ترین منزل کون سی ہے؟

(۳) درج ذیل الفاظ کے مترادف الفاظ لکھیں۔

پتھر	حیرت	دل چسپ	شوق	آبادیاں	حدود

(۴) درج ذیل الفاظ کے متضاد الفاظ لکھیں۔

تمازت	گم نام	شاہانہ	اوّل الذِکر	قدیم	داخل

(۵) درج ذیل الفاظ میں سے مذکّر اور مونّث الفاظ الگ الگ لکھیں۔

زمین	وادی	سڑک	بستیاں	دریا
گاؤں	سرائے	قلعہ	شکست	دروازہ

متشابہ الفاظ

متشابہ الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جو آواز یا شکل صورت کے لحاظ سے تو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن اِعراب، املا یا معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔ متشابہ الفاظ کی بالعموم درج ذیل تین صورتیں ہیں:

(الف) وہ الفاظ جن کا املا ایک جیسا ہو لیکن وہ معنوں کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ مثلاً: "ادا" بہ معنی ادا کرنا اور "ادا" بہ معنی طرز یا ڈھنگ۔ "بار" بہ معنی بوجھ اور "بار" بہ معنی دفعہ۔ "عرض" بہ معنی گزارش اور "عرض" بہ معنی چوڑائی۔ "کل" بہ معنی مشین اور "کل" بہ معنی آنے والا یا گزرا ہوا دن۔ "آب" بہ معنی پانی اور "آب" بہ معنی چمک۔ "دور" بہ معنی زمانہ اور "دور" بہ معنی گردش۔ "رقم" بہ معنی روپیا پیسا اور "رقم" بہ معنی لکھنا۔

(ب) وہ الفاظ جن کا املا تو ایک جیسا ہو لیکن اِعراب کی تبدیلی سے ان کے معنی میں فرق پڑ جاتا ہو، مثلاً: دَر اور دُر۔ مُلک اور مَلک، عِلم اور عَلَم۔ دَور اور دُور۔ دَھن اور دُھن۔ بَین اور بِین۔ شِیر اور شیر۔ سِحر اور سَحَر۔ اِعراب اور اَعراب۔

(ج) وہ الفاظ جن کی آواز تو بظاہر ایک جیسی ہو لیکن ان کا املا اور معنی مختلف ہوں، مثلاً: رازی، راضی۔ اثر، عصر۔ اصل، عسل۔ باز، بعض۔ چارہ، چارا۔ رسد، رصد۔ زن، ظن۔ کسرت، کثرت۔ نقطہ، نکتہ۔ لعل، لال۔ مامور، معمور۔ حضر، حذر۔ آر، عار۔

(۶) متشابہ الفاظ میں جزو (الف) اور جزو (ب) کے الفاظ کے معنی لکھیں۔

رموزِ اوقاف

آپ نے رموزِ اوقاف کی چند اہم علامتوں: سکتہ، وقفہ، وقف لازم، تفصیلیہ اور ختمہ کے بارے میں گزشتہ سبق میں پڑھا ہے۔ باقی ماندہ اہم علامتوں کی وضاحت بیان کی جاتی ہے:

استفہامیہ یا سوالیہ (؟) یہ علامت کسی استفہامیہ یا سوالیہ جملے کے آخر میں لگائی جاتی ہے۔ مثلاً: یہ کیا ہے؟ یہ کتاب کس کی ہے؟ آج کیا

تاریخ ہے؟ کون آ جا رہا ہے؟ وغیرہ

ندائیہ (!) یہ علامت دراصل لفظ "ندا" کا مخفف ہے اور لفظ "ندا" کے الف کے نیچے نون کا نقطہ لگا کر بنائی گئی ہے۔ یہ علامت وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی کو ندا دینا، پکارنا، خطاب کرنا مقصود ہو، مثلاً: خدایا! میری آرزو پوری کر دے۔ اے بھائی! ذرا میری بات سنو۔ وغیرہ

فجائیہ (!) جب تحریر میں غصہ، حقارت، تعجب، تمنا، ادب، تعظیم، ندامت، خوف، تحسین و آفرین وغیرہ جذبات کو ظاہر کرنا مقصود ہو تو یہ علامت استعمال کی جاتی ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ بلا اختیار یا خود بخود زبان سے نکل گئے ہیں۔ مثلاً: وہ اور رحم! اس کی امید فضول ہے۔ اُف! بے چارہ چل بھی نہیں سکتا۔ وغیرہ

واوین ("") اس علامت کا استعمال کسی کا قول مِن و عَن نقل کرتے وقت یا کسی اقتباس کا اندراج کرتے وقت اس قول یا اقتباس کی ابتدا اور اس کے آخر میں کیا جاتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ واوین کے اندر والی عبارت گُفت گو کرنے والے ہی کے الفاظ پر مشتمل ہے، مثلاً:

باپ نے بیٹے سے کہا: "بیٹا! محنت کرو، محنت کا پھل ضرور ملے گا۔"

مَیں نے ملازم سے کہا: "جاؤ! میرا سامان گاڑی سے نکال لاؤ۔"

قوسین () اس علامت میں، جسے انگریزی میں بریکٹس کہا جاتا ہے، کسی بات کی وضاحت کے لیے الفاظ لکھے جاتے ہیں جو لفظ معترضہ یا جملۂ معترضہ کے طور پر آتے ہیں اور انھیں حذف کر دینے سے عبارت کے ربط و تسلسل میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً:

انور صاحب (مرحوم) سے ہمارے بھی دیرینہ تعلقات تھے۔

میرا گھر (مکان کا وہ حصّہ جس میں میری سکونت ہے) خاصا بوسیدہ ہو گیا ہے۔

خط (—) انگریزی میں اس علامت کو ڈیش کہا جاتا ہے۔ جس طرح قوسین جملۂ معترضہ کو رواں تحریر سے الگ کرتی ہے، اسی طرح یہ علامت بھی نیم ختمہ کا کام دیتے ہوئے جملہ ختم کیے بغیر اس میں اچانک تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً:

میں بیمار ہوں — آپ سے ملنا بھی ضروری تھا۔

اب تو اسی تنخواہ میں — وہ جتنی بھی ہے — گزارا کرنا ہو گا۔

(۷) رموزِ اوقاف کی علامتوں: استفہامیہ یا سوالیہ، ندائیہ، فجائیہ، واوین، قوسین اور خط کی علامتوں کا استعمال کرتے ہوئے ہر علامت کی دو دو مثالیں مزید دیں۔

۸۔ درج ذیل عبارت کو توجہ سے پڑھیں اور آخر میں دیے گئے سوالوں کے جواب تحریر کریں۔

فورٹ منرو، پنجاب کے ضلع ڈیرہ غازی خان میں واقع ایک حسین پہاڑی مقام ہے جو اپنی قدرتی خوب صورتی اور دل کش مناظر کے باعث سیاحوں کے لیے ایک پُرکشش مقام ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ۶۴۷۰ فٹ بلند یہ مقام موسم گرما میں ٹھنڈی ہوائیں اور سرسبز پہاڑوں کا دل کش منظر پیش کرتا ہے۔ یہاں کے جنگلات، خوب صورت وادیاں، اور چشمے دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔ فورٹ منرو کو تاریخی اہمیّت بھی حاصل ہے، کیوں کہ یہ علاقہ ماضی میں برطانوی فوج کے لیے ایک دفاعی چوکی کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں کی مخصوص ثقافت، روایتی طرزِ زندگی اور مقامی دست کاریوں کی دکانیں بھی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ فورٹ منرو کا سفر نہ صرف فطرت سے محبت کرنے والوں کے لیے ایک خوش گوار تجربہ ہوتا ہے بلکہ وہ لوگ جو سکون اور فطرت کے قریب رہنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بھی یہ ایک بہترین تفریحی مقام ہے۔

سوالات: (الف) فورٹ منرو کہاں واقع ہے اور اس کی وجہ شہرت کیا ہے؟ (ب) فورٹ منرو کا موسم کیسا ہے؟

(ج) فورٹ منرو کی تاریخی حیثیت کا پس منظر کیا ہے؟

(د) فورٹ منرو اپنی ثقافت اور دست کاریوں کے حوالے سے کیسی شہرت رکھتا ہے؟

(ہ) اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

سرگرمیاں:

- طلبہ لائبریری یا انٹرنیٹ سے سارک (SAARC) کے ممالک کا ایک نقشہ حاصل کریں اور اس میں جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ) کی نشان دہی کریں اور ٹیوٹوریل گروپ میں بتائیں۔
- اس سبق میں جتنی بھی آبادیوں کا تذکرہ ہوا ہے، طلبہ اس کی ایک فہرست بنائیں۔

اشاراتِ تدریس

۱۔ اساتذہ برِ عظیم پاک و ہند کا ایک بڑا سا نقشہ حاصل کریں اور سنار گاؤں (بنگلہ دیش) سے کابل (افغانستان) تک جرنیلی سڑک کی نشان دہی کرائیں۔

۲۔ اساتذہ طلبہ کو بتائیں کہ قدیم زمانے میں اسی شاہرہ کے راستے قافلے گزرا کرتے تھے۔

۳۔ اساتذہ طلبہ کی معلومات میں اضافہ کریں کہ شمال مغرب کی طرف سے جتنے بھی حملہ آور (سوائے محمد بن قاسم کے) ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لیے آئے، وہ اسی شاہراہ کے راستے آئے۔

۴۔ اساتذہ ان تمام بڑے بڑے دریاؤں کے نام سے طلبہ کو آگاہ کریں جو اس شاہراہ کے راستے میں پڑتے ہیں۔

www.ilmkidunya.com